تعارف کتب

پاکستان کے معاشی مسائل (بزبانِ انگریزی) تالیف: سید عنایت حسین صاحب۔ ایم۔اے (معاشیات) (آرنلڈ گولڈ میڈل)

اس کتاب کے فاضل مصنّف علم معیشت سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ آلو کی فصل کے متعلق ان کے مختلف مضامین جو بعض اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں اُن کے مطالعہ سے اُن کی ذہانت اور تبحّر علمی کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی اور صرف معاشیات کے طلبا تک محدود رہی۔ گذشتہ سال صدر محترم کی گراں قدر رائے نے اس فاضلانہ تصنیف کو ملک کے اندر اور باہر ایک نہایت اونچا مقام عطا فرمایا ہے۔ اس تصنیف میں مقدمہ کے علاوہ ۲۳ ابواب ہیں، جن میں پاکستان کے معاشی مسائل پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔

پاکستان کی معیشت کے بارے میں اُردو اور انگریزی میں کئی ایک کتابیں موجود ہیں لیکن اس کتاب کو ان سب پر اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ اس میں پاکستان کے فکری پس منظر سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ہماری معاشی ترقی کی راہ میں ہمارے بعض اساسی افکار و تصوّرات حائل ہیں۔ اس لیے جب تک ان کے اندر کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کی جاتی اہلِ پاکستان کی خوشحالی حکایتِ تشنہ و سراب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

کتاب کے فاضل مصنّف بالکل آغاز ہی میں ہماری قومی زندگی میں معاشیات کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میں تو اس سے بھی تجاوز کر کے یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اسلام کے احیاء کے لیے کوئی تحریک بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمانوں کی معاشی

نقطۂ نظر سے تعبیر نو نہ کی جائے۔ اس کے بغیر نہ تو اُن کے ایمان میں ثبات پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اُن کے اعمال کو غیر متزلزل بنیادیں فراہم ہو سکتی ہیں"۔ (صفحہ ۱۷۱)

اس مقصد کے حصول کے لیے وہ جس تدبیر کی نشاندہی کرتے ہیں وہ یہ ہے:

"معاشی مسائل کو صرف معاشی قوانین کی مدد سے ہی حل کیا جائے کیونکہ مذہب سے ان کا انسلاک دونوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتا ہے"۔

ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑتے کہ جناب عنایت حسین صاحب کا یہ قول کہاں تک درست ہے اور بڑے بڑے معیشت دان مثلاً مارشل، پیگو اور لارڈ کینز اس نظریہ کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں خود اُن کی اپنی تصریحات ہی نقل کرتے ہیں۔

کتاب کے صفحہ چالیس پر اسلام اور معیشت کے عنوان کے تحت وہ رقمطراز ہیں:

"دنیا کے بیشتر مذاہب کے برعکس اسلام اپنے ماننے والوں کو زندگی کے روزمرہ کاروبار میں جس میں معاشی اور معاشرتی سرگرمیاں بھی شامل ہیں، شرکت کی پوری پوری آزادی عطا کرتا ہے۔ انہیں اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ وہ اخلاقی حدود و قیود کے اندر رہ کر اپنی فطری احتیاجات کو پورا کریں"۔

فکر و نظر کا یہ تضاد ایسا ہے جسے ہم دُور کرنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتے۔ اس تضاد کی سب سے بڑی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ فاضل مصنف قوانینِ شرعی اور قوانینِ طبیعی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تمام سائنٹفک قوانین جن کے تحت قدرت کا یہ کارخانہ ایک لگے بندھے ضابطے کے تحت چل رہا ہے وہ ہمارے کے سارے اسلامی ضوابط ہی ہیں اور صرف ان کی پیروی ہی سے اسلام کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ تصور اتنا غلط اور لغو ہے کہ اس سے دین کی پوری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اگر اسلام صرف قوانینِ طبیعی کی پیروی کا ہی دوسرا نام ہے تو پھر دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور کتبِ سماوی کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ انسانی ہدایت کے لیے اس نظریہ کی رو سے سائنس دان اور اُن کے انکشافات ہی کافی ہیں۔

یہ چیز تو اسلام کی عین ضد ہے۔ دنیا میں جتنے انبیاء تشریف لائے ہیں انہوں نے نوعِ انسانی کو یہ بتایا ہے کہ قوانینِ طبیعی سے جو قوت و طاقت اسے حاصل ہوتی ہے اسے کس طرح قوانینِ شرعی کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے۔

دورِ جدید میں جو زبردست انتشار نظر آرہا ہے وہ صرف قوانینِ طبیعی کی بے قید پیروی کی وجہ سے ہی ہے۔ اور ایک مغربی مفکر کے بقول "اہلِ مغرب کو سائنس نے وہ قوت طاقت بخشی ہے جو دیوتاؤں کے شایانِ شان ہے مگر وہ اس سے سکول کے ناتراشیدہ بچوں کی طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں"۔

ہمیں فاضل مصنف کا یہ نظریہ بھی کچھ عجیب و غریب سا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے لوگوں میں یاس و قنوطیت کے جو جذبات بڑی سرعت کے ساتھ پرورش پا رہے ہیں ان کا سبب معاشی ترقی کی سست رفتاری ہے۔ اس ملک میں معاشی استحکام کے لیے جو کچھ کیا جارہا ہے وہ کچھ زیادہ تشویش ناک نہیں۔ یہاں اصل تکلیف دہ صورت جس نے لوگوں کو سخت مایوس کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے معاملے میں اس قوم کے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے انہیں پورا نہیں کیا گیا۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس قوم کی بددلی کا حقیقی سبب ہے۔

فاضل مصنف نے کتاب کے چوتھے باب میں جن افکار و نظریات کا اظہار کیا ہے اور جو درحقیقت اُن کے نزدیک اس کتاب کی جان ہیں، اُن میں سے بھی اکثر و بیشتر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

انہوں نے اپنی بحث اس غلط مفروضے پر اٹھائی ہے کہ مذاہب طبیعی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ ہندوستان کے طبیعی حالات پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اس بیمِ برِاعظم کی شادابی نے لوگوں کو مختلف آستانوں پر جھکنے کے لیے آمادہ کیا۔ یہ تصور بڑا ہی غلط اور گمراہ کن ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں پہاڑوں، دریاؤں اور سبزہ زاروں کی کثرت نے بت پرستی کو جنم دیا ہے تو پھر ہمیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ عرب میں ان چیزوں

کی قلت نے لوگوں کے اندر خدا تعالےٰ واحد کے سامنے سرنگوں ہونے کا احساس پیدا کیا۔ یہ نظریہ سراسر باطل ہے مذہب ماحول کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ مختلف قومیں اپنے عقائد کے مطابق ماحول میں تصرف کرتی ہیں۔ پچھلی صدی میں اس نظریہ کو مغرب میں کسی حد تک قبولِ عام نصیب ہوا تھا، لیکن بہت جلد ہی اسے ترک کر دینا پڑا۔ دنیا میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جہاں فطرت بڑی فیاض نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود اُس سرزمین میں جتنے مذاہب پھلے پھولے اُن سب کا مزاج سراسر توحیدی تھا۔ انسان فطرت کے اعتبار سے ایک خدا کا پرستار ہے اور دنیا کے سارے سچے مذاہب نے اسی بات کی تلقین کی ہے۔ وہ اگر اس جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا ہے تو یہ اس کی اپنی بے راہ روی ہے، اس میں طبیعی ماحول کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

جناب عنایت حسین صاحب کی یہ بات بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کی بنیاد صرف عمل پر رکھی گئی ہے نہ کہ اعتقاد پر۔ ہم قرآن و سنت سے آج تک یہی سمجھتے چلے آئے ہیں کہ اسلام میں بنیادی اہمیت اعتقاد کو حاصل ہے کیونکہ اعتقاد ہی سے وہ اندازِ فکر پیدا ہوتا ہے جو بالآخر انسانوں کو سیرت و کردار کے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے اور پھر اسی سے ایک تہذیب و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے اپنے ان متجددانہ افکار و نظریات کے حق میں ٹینی سن کے اُسی پامال شعر سے سندِ جواز حاصل کی ہے جو متجددین کا اس ملک میں واحد فکری سہارا ہے یعنی "پرانا نظام ایک نئے نظامِ حیات کے لیے جگہ خالی کر رہا ہے اور خداوند تعالیٰ اپنے آپ کو مختلف جاموں میں جلوہ گر کرتا ہے"۔ اس شعر کو درج کرنے کے بعد وہ پھر پورے زور کے ساتھ یہ فرماتے ہیں :-

> دوسری اقوام نے پرانے لیبل اپنے اوپر چپکائے رکھنے کے باوجود اپنی آئیڈیالوجی اور طرزِ عمل میں دورِ جدید کی روشنی میں عظیم تبدیلیاں کی ہیں۔ مسلمان مذہب کو سیاست اور معیشت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی وجہ سے ایک عجیب و غریب الجھن میں گرفتار ہو

گئے ہیں . . . . . ان کے بوسیدہ افکار و نظریات اُن کی گردنوں میں طوق بن کر لٹکے ہوئے ہیں اور وہ انہیں نئے اور ترقی یافتہ طریقوں کے اختیار کرنے سے ہمیشہ باز رکھتے ہیں۔ مذہب کے اصل سرچشموں سے اُن کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ لیکن انہوں نے دوسری اقوام کی طرح اس بات کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی کو قومیت کی بنیاد پر پھر سے تعمیر کریں۔ (صت ۴۲)

چند صفحات کے بعد بلّی پوری طرح تھیلے سے باہر آجاتی ہے اور وہ بڑے واشگاف الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"اس بیماری کا علاج یہی ہے کہ امورِ دنیا کو دین سے یکسر الگ کر دیا جائے اور اُس پالیسی کو واضح طور پر اپنا لیا جائے جسے اتاترک نے ترکی میں اختیار کیا تھا"

جناب عنایت حسین صاحب کی اس پوری بحث کا مرکز و محور یہی نقطہ ہے اور اسی پر انہوں نے قوم کی توجہ منعطف کرانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں جو متجددین عام طور پر استعمال کرتے ہیں، یعنی اسلام کی جدید تعبیر پر زور، ملّا کو گالیاں دینا، سرسید اور اتاترک کی بے پناہ تعریف و توصیف اور علامہ اقبال کے کلام سے ناجائز انتفاع۔

تبصرہ نگار نے علامہ اقبال مرحوم کی قریب قریب ساری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے لیکن اسے بڑی تلاش و جستجو کے باوجود کہیں یہ نظر نہیں آیا کہ علامہ صاحب نے دین و سیاست کی جدائی کی تلقین کی ہو۔ انہوں نے تو ہمیشہ اسی بات پر زور دیا ہے: ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہم نے اس بات کا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کی ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کونسے ایسے علماء تھے جنہوں نے امتِ مُسلمہ کو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور مغربی ایجادات و انکشافات سے بے بہرہ رکھنے کی احمقانہ سعی کی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں اس معاملے میں سخت ناکامی ہے۔

علمائے ربانی نے جس چیز کی مخالفت کی تھی، وہ مغربی علوم و فنون کا اکتساب نہ تھا بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی تھی اور یہ چیز آج بھی قوم کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ آج سے سو برس پہلے تھی۔ مغربی تہذیب کے پرستار اس کی مدح میں جو چاہیں کہتے رہیں لیکن حالات نے علماء (اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے) کے اس موقف کو بالکل صحیح اور درست ثابت کیا ہے۔ یہ اسی مغربی تہذیب کی ذہنی غلامی کا نتیجہ ہے کہ کچھ لوگ یہاں بڑی بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنا مقصدِ حیات تک تبدیل کر دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

فاضل مصنف نے حکومت پاکستان کو ایک "سٹیٹ چرچ" کے قیام کا بھی مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

"یہ وہ مناسب وقت ہے جب ہمیں ایک ایسا بورڈ قائم کرنا چاہیے جس میں آزاد اور جدید تصورات رکھنے والے علما کو شامل کیا جائے تاکہ وہ مولانا جلال الدین رومی، علامہ اقبال اور اتاترک کے نظریات کے مطابق اسلامی افکار کی تشکیلِ جدید کریں۔"

مولانا جلال الدین رومی اور علامہ اقبال کے نام تو محض اس مشن کو مقدس بنانے کی غرض سے شامل کیے گئے ہیں، ہدایت کا اصل منبع تو صرف اتاترک ہے۔ ہمیں ان تینوں کے افکار و نظریات کے درمیان کوئی قدرِ مشترک ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ ایک الجھا ہوا ذہن ہی ان تینوں کو جمع کر سکتا ہے۔

آخر میں ایک آدھ مثال مصنف کے طرزِ استدلال کی بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ ایک مقام پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سیاسی قوت معاشی قوت ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ عربی کی مشہور ضرب المثل الناس علیٰ دین ملوکہم پیش فرماتے ہیں۔

کتاب کو دینِ محمدی پریس نے عمدہ طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔